جملہ حقوق محفوظ

سسّی پنوّں

پنجاب کی مشہور داستان

جسے

بچّوں کیلئے آسان زبان میں لکھّا گیا

سنہ ۱۹۴۰ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل

قیمت ۶؍

Taj Tahir Foundation

جملہ حقوق محفوظ

سسّی پنّوں

پنجاب کی ایک دلچسپ دیہاتی داستان

آسان اردو میں

سنہ ۱۹۳۹ء

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل قیمت ۶/

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

دیباچہ

ہیر رانجھا - سوہنی مہینوال - سسّی پُنّوں پنجاب کے وُہ دیہاتی افسانے ہیں - جن سے پنجاب کے دیہات کا بچہ بچہ واقف ہے - پنجابی زبان کے شاعروں نے ان داستانوں کو نہایت دلاویز انداز میں نظم کر کے ان میں ہر پنجابی کے لئے لازوال دلچسپی پیدا کر دی ہے ٭

مدّت سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی - کہ ان داستانوں کو غیر ضروری تفصیل اور ناواجب حصّوں سے پاک کر کے اُردو زبان میں لکھا جائے - تاکہ ایک تو اُردو پڑھنے والے بچے اور بالغ ان داستانوں سے واقف ہو جائیں - دُوسرے اردو زبان میں ہمارے صُوبے کی دیہاتی زندگی کے متعلّق معلومات کا اضافہ ہو جائے - آخر دارالاشاعت پنجاب نے

Taj Tamir Foundation

اس کام کو اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ ان تینوں قصّوں کو آسان اور سلیس اردو میں لکھ کر شائع کیا جا رہا ہے۔ مہذّب ممالک اپنے دیہاتی قصّوں اور مقامی داستانوں کو محفوظ کرنے میں بے حد اہتمام سے کام لیتے ہیں۔ ہم نے پنجاب میں اس کام کو شروع کر دیا ہے۔ اور ان تین داستانوں کے بعد اسی قسم کے دُوسرے افسانوں کو بھی آسان اُردو میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ؀

ہمیں یقین ہے۔کہ بچّے اور کم خواندہ بالغ ان قصّوں کو کو پڑھ کر بے حد مسرور ہوں گے ؀

کارکنان دارالاشاعت پنجاب لاہور

سُلطان آدم جام

مُدّتیں گذریں۔ پنجاب کے جنوب مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے ایک خُوب صُورت اور عالی شان شہر آباد تھا۔ اس شہر کا نام بھنبور تھا۔ اور یہاں سُلطان آدم جام حکومت کرتا تھا۔

سُلطان آدم جام بہت نیک دِل بادشاہ تھا۔ اُس کے ملک میں ہندو مسلمان دونوں بستے تھے۔ مگر سب خوش حال تھے۔ اور بادشاہ کی سلامتی کی دُعائیں کرتے تھے۔ سُلطان کو اَور تو کسی بات کا غم نہیں تھا۔ مگر بے اولادی کا غم اُسے کھائے جا رہا تھا۔

Taj Tahir Foundation

ایک دِن بادشاہ نے اپنے ملک کے تمام نجومیوں کو بلا کر کہا۔ اپنے عِلم سے حساب لگا کر بتاؤ کہ میری قسمت میں اولاد بھی ہے؟ یا میں نامراد ہی دُنیا سے اُٹھ جاؤں گا؟

نجومیوں نے حساب لگا کے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی "بادشاہ سلامت۔ آپ کی قسمت میں اولاد ہے تو سہی۔ مگر آپ اپنی اولاد سے سُکھ نہیں پائیں گے۔ آپ کے ہاں بہت جلد ایک لڑکی پیدا ہو گی۔ جو خُوب صُورتی میں چاند کو شرمائے گی۔ مگر وُہ جوان ہو کر ایک شہزادے پر عاشق ہو جائے گی۔ اور سندھ کے تپتے ہوئے تھلوں میں جان دے دے گی"۔

بادشاہ یہ خبر سُن کر پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہوُا۔ مگر تقدیر کے لکھّے کو کون مٹا سکتا ہے؟ اسی سال بادشاہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ بادشاہ کو

Taj Tahir Foundation

نجومیوں کی بات یاد تھی۔ اُس نے اپنے لائق اور دانا وزیر کو بُلا کر اس سے کہا۔ نجومیوں نے اس لڑکی کے متعلق جو کچھ کہا تھا۔ تُمہیں یاد ہے۔ چونکہ اس لڑکی کی وجہ سے ہماری بہت بدنامی ہوگی۔ اِس لئے بہتر ہے۔ کہ اس ناشُدنی کو قتل کر دیا جائے

وزیر نے ہاتھ باندھ کر بادشاہ سلامت کی خِدمت میں عرض کی۔" حضُور! آپ مالک ہیں لیکن ایک بے گناہ اور معصُوم بچّی کو قتل کرنا نہ تو آپ کے عدل و انصاف کے شایانِ شان ہے۔ اور نہ خدا اسے پسند کرے گا۔ آپ اللہ کی رحمت سے مایُوس نہ ہو جیئے۔ مُجھے یقین ہے۔ کہ اگر اس بچّی کی تربیت احتیاط سے ہوئی۔ تو نجومیوں کا کہا انشاء اللہ غلط ثابت ہوگا"۔

اِس بات سے بادشاہ کی تسلّی نہ ہوئی۔ اُس نے کہا۔ کہ نجومیوں کی ایک بات تو پُوری ہوئی۔

دُوسری بھی پُوری ہو کے رہے گی۔ اِس لیئے بہتر ہے۔ کہ اِس ناشُدنی کو ابھی قتل کرا دِیا جائے ۔

جب وزیر نے دیکھا۔ کہ بادشاہ معصُوم بچّی کے قتل پر تُلا ہُوا ہے۔ تو اُس نے کہا۔" جہاں پناہ اگر آپ کو سچ مُچ یقین آگیا ہے۔ کہ نجومیوں نے جو کُچھ کہا ہے۔ وُہ بالکل سچ ہے۔ تو اس بچّی کو قتل کرنے کے بجائے ایک صندوق میں بند کر کے دریا کی لہروں کے حوالے کر دِیجیئے۔ قُدرت کو اگر اُس کا بچانا منظور ہو گا۔ تو وُہ کسی نہ کسی طرح بچ جائے گی۔ ورنہ دریا کی لہریں اس کا کام تمام کر دیں گی"۔

بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اور اُس نے اسی وقت ایک کاری گر مستری کو بلا کر ایک خوبصورت صندوق بنانے کی تاکید کی۔ مستری نے شاہی فرمان پا کر اُسی وقت صندوق بنانا شروع کر دیا۔

Taj Tahir Foundation

اِدھر معصوم بچّی کو دریا کے حوالے کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ لیکن اُدھر شاہی محل میں کسی کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ وہاں خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور شادیانوں کے شور میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی ۔

شام تک صندوق تیار ہو گیا۔ بادشاہ نے وزیر سے پُوچھا "اب کیا کیا جائے؟" وزیر نے عرض کی "بادشاہ سلامت۔ یہ کام اس طرح چُپ چُپاتے ہونا چاہیئے۔ کہ حضور کے اِس خادم کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ دُوسرے آپ جانتے ہیں۔ کہ بچیوں کا ماں باپ پر بڑا حق ہوتا ہے۔ اس بدقسمت بچّی نے بادشاہِ وقت کے گھر میں جنم لیا۔ مگر پیدا ہوتے ہی اس کی موت کا فیصلہ ہو گیا۔ آخر آپ کی بچّی ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنی دولت سے اس کا حصّہ علحدہ کر کے

کر کے اس کے ساتھ ہی صندوق میں رکھ دیں"۔
بادشاہ کو یہ بات بہت پسند آئی۔ اور اُس نے وزیر کے مشورے کے مُطابق خزانچی کو خزانے سے لعل و جواہر لانے کا حُکم دِیا۔
تھوڑی ہی دیر میں خزانچی قیمتی موتیوں اور ہیروں کے ڈبّے لے آیا۔ دانا وزیر نے اس دولت کے تین حصّے کِئے۔ اور صندوق میں علحدہ علحدہ رکھ کر ایک فرمان لکھا۔ کہ اس دولت کا ایک حصّہ اُس کے لِئے ہے۔ جو اِس بچّی کو پالے اور جوان کرے۔ اور دُوسرا اُس کے لیئے جو بچّی کو تعلیم دے۔ اور تیسرا بچّی کا جہیز ہے۔ اس فرمان کے علاوہ ایک اَور تحریر لکھ کر رکھ دی۔ کہ یہ بچّی بھنبور کے بادشاہ آدم جام کی بیٹی ہے۔
اس کام سے فارغ ہو کر وزیر نے بادشاہ سلامت سے عرض کی۔ کہ شہزادی کو دریا میں پھینکنے

Taj Tahir Foundation

کا کام آج رات کے وقت حضور کو اور اس غلام کو انجام دینا ہوگا۔ میں آدھی رات کو بھیس بدل کر حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔ آپ بھی بھیس بدل لیجئے گا۔ تاکہ رعایا میں سے اگر کوئی دیکھ پائے۔ تو پہچان نہ سکے۔

بادشاہ اس پر راضی ہو گیا۔ آدھی رات کے وقت وزیر آگیا۔ بادشاہ پہلے ہی بھیس بدل کر تیار بیٹھا تھا۔ وہ دبے پاؤں محل میں گیا۔ تاکہ اگر ملکہ سو رہی ہو۔ تو چپکے سے بچّی کو اُٹھا لائے۔ مگر ماؤں کا دل تو ہر وقت اولاد میں ہوتا ہے۔ بادشاہ نے جوں ہی بچّی کو اُٹھانا چاہا۔ ملکہ چونک پڑی۔ اور بادشاہ کو عجیب سے لباس میں کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ بادشاہ نے جھپٹ کر ملکہ سے بچّی کو چھیننا چاہا۔ مگر وہ دیوانوں کی طرح بادشاہ سے لپٹ گئی۔ اور رو رو کر کہنے لگی۔ کہ "آپ کو کیا ہو گیا

ہے۔ اور آپ اِس معصوم بچّی کو کہاں لئے جا رہے ہیں؟"

بادشاہ نے کڑک کر کہا۔" میں اس منحوس کو دریا میں پھینک دینا چاہتا ہُوں"۔

یہ سُن کر ملکہ کی چیخ نکل گئی۔ اور وُہ بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ اس نے بادشاہ کی بُہت منّت سماجت کی۔ مگر بادشاہ نے ایک نہ سُنی۔ بچّی کو ملکہ سے چھین لیا۔ اور اُسے لے کر محل سے باہر نکل گیا۔ مامتا کی ماری ملکہ روتے روتے گر پڑی۔ اور گر کر بے ہوش ہو گئی۔

رات کا اندھیرا ابھی دُنیا پر چھایا ہوُا تھا۔ کہ بادشاہ اور وزیر دریا پر پہنچے۔ وزیر نے صندُوق کو پانی پر چھوڑ کر خدا کے حوالے کر دیا۔ یہ کام سرانجام دیتے ہوئے وزیر کی آنکھوں سے آنسو

نکل آئے۔ اور بادشاہ بھی جگر تھام کر رہ گیا ؋
صبح ہونے سے پہلے بادشاہ اور وزیر اپنے
اپنے بستر پر پڑ کر سو رہے ؋

Taj Tahir Foundation

اتا دھوبی

جس جگہ بادشاہ اور وزیر نے صندوق کو موجوں کے حوالے کیا تھا۔ اُس سے کچھ فاصلہ پر دھوبیوں کا گھاٹ تھا۔ جہاں شہر کے تمام دھوبی آکر کپڑے دھوتے اور چھوا چھو کا راگ گاتے تھے۔ اِن دھوبیوں میں ایک کا نام اتّا تھا۔ اُس بچارے کا کام تو خُوب چلتا تھا۔ اور شہر کے بڑے بڑے امیر اُسی سے کپڑے دُھلواتے تھے۔ مگر چونکہ اس کے گھر اولاد کوئی نہ تھی۔ اِس لئے وُہ بہت رنجیدہ رہتا تھا ؎

اتا نے دو تین شادیاں کیں۔ مگر اولاد نہ

Taj Tahir Foundation

ہوئی۔ اب خود تو وُہ ادھیڑ عُمر کا تھا۔ مگر اولاد کی خاطر
اُس نے ایک نوجوان عورت سے شادی کر لی تھی۔
یہ عورت اتا کو بہت تنگ کرتی تھی۔ بچارے
دھوبی کو اولاد کی فکر میں رات بھر نیند نہ آتی تھی۔
وُہ ہر روز بہت سویرے اُٹھ کر دریا پر چلا جاتا۔
اور ساتھ ہی بیوی کو بھی لے جاتا تھا۔ جب دن
چڑھ آتا۔ تو اُس کی بیوی واپس آجاتی۔ اور کھانا
وغیرہ پکا کر شوہر کے لئے لے جاتی۔

جس رات بادشاہ نے بچّی کو دریا میں پھینکا
اُس رات اتا بھی پچھلے پہر جاگ اُٹھا۔ اور اُٹھتے
ہی بیوی کو جگایا۔ وُہ آنکھ کھلتے ہی شوہر کو بُرا
بھلا کہنے لگی۔ کہ تم نے آدھی رات کو ہی مجھے جگا
دیا۔ مگر دھوبی نے اُسے سمجھایا۔ کہ "اری نیک بخت
پچھلا پہر ہے۔ کوئی دم میں صُبح ہونے والی ہے"۔ آخر
بیوی بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔ اور کپڑے پہن کر چلنے کو

Taj Tahir Foundation

تیار ہو گئی۔ اتنے میں اتا نے نماز سے فراغت پائی۔ اور لادی لاد گھاٹ کی طرف چل پڑا ۔

جب دونوں میاں بیوی دریا کے کنارے پہنچے۔ تو ابھی اندھیرا تھا۔ بیوی میاں پر خفا ہونے لگی۔ کہ ابھی تو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ میں یہاں بیٹھ کے کیا کروں گی ۔

اتا نے کہا۔ "نیک بخت۔ شور کیوں مچاتی ہے اگر تیرے خیال میں ابھی بہت سویرا ہے۔ تو کپڑا بچھا کر سوجا۔ میں اتنے میں آگ سلگا کر حقہ پی لیتا ہوں" ۔

اُس کی بیوی جھلّا کر بولی۔ "یہاں کیا زمین پر پڑ رہوں۔ نیند کیسے آئے گی؟"

اتا بولا۔ "کوئی فکر نہ ہو۔ تو نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اور فکر ہو تو شاہی محلوں میں بھی رات تارے گنتے گذرتی ہے" ۔

بیوی جھنجھلا کر بولی "ہاں مجھے تو فکر ہی نہیں۔ سارے جہان کے فکر تمہیں ہی تو ہیں"۔ یہ کہہ کر وُہ رونے اور بسورنے لگی "ہائے۔ مجھے ماں باپ نے کس کے پلّے باندھ دِیا۔ اس سے تو بہتر تھا۔ مُجھے بھاڑ میں جھونک دیتے۔ اس نامُراد کے گھر تو جی بہلانے کو کوئی بچّہ بھی نہیں"۔

یہ سُن کر اَتا کے آنسُو نکل پڑے۔ اُس نے کہا "نیک بخت اس میں میرا کیا قصُور ہے۔ خُدا سے دُعا کر۔ وُہ رحم کرے۔ تو کیا نہیں ہو سکتا"۔

اسی جھگڑے میں صُبح ہو گئی۔ اتا نے کپڑے اُٹھائے۔ اور پانی میں اُترنے لگا۔ اچانک اُس کی نظر ایک صندُوق پر پڑی۔ اُس نے بیوی کو پُکار کر کہا "اری نیک بخت۔ دیکھنا تو یہ کیا بہا جا رہا ہے"۔

ابھی اُس کی بیوی نے کوئی جواب نہ دِیا

Taj Tahir Foundation

تھا۔ کہ اتا نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اور تھوڑی دیر میں صندوق کو کنارے پر لے آیا ٭
اتا کی بیوی بھی دوڑ کر آ گئی۔ صندوق کھولا تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک ننھی سی بچّی لیٹی ہوئی انگوٹھا چوس رہی ہے۔ یہ دونوں اُسے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ اتا کی بیوی نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور پیار کرنے لگی ٭
اتا کی بیوی تو یہ دولت پا کر سب کچھ بھول گئی۔ اور اتا کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ جب اُنہوں نے صندوق میں رکھّی ہوئی دَولت کو دیکھا۔ تو مارے خوشی کے آپے میں نہ رہے۔ دونوں کو یقین آ گیا۔ کہ خدا نے ان کی دُعائیں سُن لی ہیں۔ اور ان کا جی بہلانے کے لئے بہشت سے ایک خوب صورت بچّی بھیج دی ہے ٭
اتا نے کپڑوں کا گٹھڑ باندھا۔ اور ابھی سورج

بھی نہ نِکلا تھا۔ کہ گھر واپس آگیا۔ سُورج نکلنے کے بعد جب دُوسرے دھوبیوں نے دیکھا۔ کہ آج اتا نہیں آیا۔ تو وُہ سمجھے شاید وہ بیمار ہوگیا ہے ؎

چند دِنوں تک اِدھر اُدھر دھوبیوں میں اِس بات کا بڑا چرچا رہا۔ کہ اتا کو دریا سے صندُوق ملا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد لوگ اس بات کو بھول گئے۔ صندُوق سے جو دَولت نکلی تھی۔ اُسے اتا اور اُس کی بیوی بچّی کی امانت سمجھتے تھے۔ اُسے اُنھوں نے نہ تو ہاتھ لگایا۔ اور نہ کسی سے اُس کا ذِکر کیا ؎

اب اتا کے لئے ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی۔ اُس کی بیوی نے لڑنا جھگڑنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور بڑے آرام سے دونوں کی زِندگی بسر ہوتی تھی۔ معاش کی طرف سے وُہ پہلے ہی بے فکر تھا۔ صرف اولاد کی کمی تھی۔ خدا نے ایک

Taj Tahir Foundation

خوب صورت بچّی دے کر وہ بھی پوری کردی ۔ بچّی کا نام ستّی رکھا گیا ۔ اور بڑے چاؤ چونچلے سے اُس کی پرورش ہونے لگی ۔ جب ستّی کی عمر پانچ سال ہوگئی ۔ تو اُسے مسجد میں قرآن پڑھنے بٹھایا ۔ ستّی نے بہت تھوڑے عرصے میں قرآن مجید ختم کر لیا ۔ مولوی صاحب نے یہ دیکھ کر کہ ستّی بہت ذہین لڑکی ہے ۔ اسے دوسری دینی کتابیں پڑھانی شروع کردیں ۔ ستّی نے جی لگا کر پڑھا ۔ اور آٹھ دس سال کی عمر میں کئی دینی کتابیں جن کا پڑھنا ضروری ہے ۔ ختم کرلیں ۔ ستّی کو کوئی فکر نہ تھی ۔ اتا اور اُس کی بیوی نے اُسے اپنی اولاد سمجھ کر بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا ۔ ستّی بھی اُن ہی کو اپنا ماں باپ سمجھتی تھی ۔ وہ اگرچہ ایک غریب دھوبی کے ہاں پلی اور بڑھی ۔ مگر بادشاہ کی بیٹی تھی ۔ اور کھُلی ہوا

میں دریا کے کنارے کھیل کُود کر جوان ہوئی تھی۔
چنانچہ جوان ہوکر وہ بہت خوب صُورت نکلی۔ اس
کے لمبے لمبے سیاہ بال۔ بڑی بڑی آنکھیں پھُول
سا نِکھرا ہُوا رنگ۔ اور چاند سا چہرہ دیکھنے والوں
کے دِل موہ لیتے تھے۔ ہمارے شہر کے دھوبیوں
میں کوئی گھر ایسا نہ تھا۔ جس کی یہ خواہش نہ ہو۔
کہ سسّی اس گھر کی بہُو بنے۔ کتنے بُوڑھے اور
بُوڑھیوں کے دل میں یہ حسرت تھی۔ کہ سسّی اُن
کے ہاں بیاہ کے آئے۔ اور کئی نوجوان دھوبیوں
کو اس آرزُو نے بے تاب کر رکھا تھا۔ کہ سسّی
اُن کی بیوی بنے۔

سسّی نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اُس
نے کئی دفعہ لوگوں کو کہتے سُنا تھا۔ کہ وُہ اصل میں
دھوبی کی بیٹی نہیں۔ جب سسّی سیانی ہو گئی۔ تو اُس
نے ایک دِن اتا سے اس بات کا ذکر کیا۔ وُہ

Taj Tahir Foundation

حَیران ہوکر بولا۔ "بیٹی تُجھ سے یہ کِس نے کہہ دِیا۔ تُو تو میری اپنی بیٹی ہے"۔

سستی نے کہا "ابّا جان۔ مَیں اپنی سہیلیوں اور اُن کے بزرگوں سے ایسا ہی سُنتی ہُوں"۔

ابّا نے پہلے تو سستی کو ٹالنا چاہا۔ لیکن جب اُس نے ضِد کی۔ تو وہ کہنے لگا۔ "بیٹی۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ مَیں نے تمہیں دریا میں بہتے ہوئے ایک صندُوق میں پایا تھا۔ وہ صندُوق اور اُس میں جو جو چیزیں تھیں۔ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں"۔

یہ کہہ کر ابّا صندُوق اُٹھا لایا۔ صندُوق میں جس قدر چیزیں تھیں سستی نے سب کو کھول کر دیکھا۔ جب اُس نے وزیر کا رُقعہ پڑھا۔ تو اُس کی آنکھیں کُھل گئیں اور اُسے معلوم ہوگیا۔ کہ مَیں بھنبور کے بادشاہ کی بیٹی ہُوں لیکن یہ بھید

اُس نے اپنے دھوبی باپ پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ ستّی کو وزیر کے لکھّے ہوئے فرمان سے یہ عِلم بھی ہو گیا تھا۔ کہ بادشاہ نے اُسے منحوس جان کر دریا میں پھینک دِیا تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنا حال بادشاہ پر ظاہر کرنا مُناسب نہ سمجھا۔ اور پہلے کی طرح اتا کے گھر زندگی کے دِن گُذارتی رہی۔ مگر اب دھوبی کے ہاں اُس کا جی نہ لگتا تھا۔ اور یہ خیال اُس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ کہ میَں بادشاہ کی بیٹی ہُوں۔ میری شادی کسی مُلک کے شہزادہ کے ساتھ ہونی چاہیئے۔

Taj Tahir Foundation

شہزادہ پنّوں خان

پنجاب کے جنوب میں بلوچستان کا علاقہ ہے۔ جس زمانے میں بھنبور میں سلطان آدم جام کا راج تھا۔ اسی زمانے میں بلوچستان کے ایک علاقے کیچ مکران کی حکومت سلطان علی خان کے ہاتھ میں تھی۔ سلطان علی خان بہت نیک دل بادشاہ تھا۔ اور اُسے رعایا کے آرام و آسائش کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اُس کی حکومت میں چوری چکاری کا بالکل خطرہ نہیں تھا۔ دُور دُور سے سوداگروں کے قافلے کیچ مکران میں آتے تھے۔ اور مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔

Taj Tahir Foundation

خدا کی شان سلطان علی خان کے گھر میں بھی
کوئی اولاد نہ تھی۔ بے اولادی کے غم نے اُس
بچارے کو نڈھال کر رکھا تھا۔ اور وُہ تنہائی میں
رو رو کر خدا سے دُعائیں کرتا تھا۔ کہ اپنے فضل و
کرم سے میرے اُمّیدوں کے باغ میں بھی مُراد کا
پھُول کھِلا دے ؀

آخر بادشاہ کی دُعائیں قبُول ہوئیں۔ اور
بُڑھاپے میں اللہ تعالےٰ نے اُسے چاند سا
فرزند عطا فرمایا۔ لڑکے کی پیدائش کی خبر بادشاہ
کو پہنچی۔ تو اُس نے خزانوں کے مُنّہ کھول دِئے
اور اعلان کر دِیا۔ کہ میری سلطنت میں کوئی بھُوکا
ننگا نہ رہے۔ ہر بڑے شہر اور قصبے میں بادشاہ
کی طرف سے لنگر کھُل گئے۔ غریبوں نے پیٹ
بھر بھر کر کھانا کھایا۔ اور بادشاہ اور شہزادے
کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے لگے۔ بادشاہ نے

Taj Tahir Foundation

شہزادے کا نام پُنّوں خان رکھا ۔

پُنّوں خان بادشاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی۔ اور جب وُہ باتیں کرنے لگا۔ تو اُس کی تعلیم کے لئے بڑے بڑے لائق اُستاد رکھے گئے۔ پُنّوں خاں کو خدا نے خُوبصورتی کے علاوہ ذہن بھی بہت اچھا عطا کیا تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُسے عِلم سے دِلی لگاؤ تھا۔ اُستادوں کی محنت اور شہزادے کے شوقِ علم کا نتیجہ یہ نِکلا۔ کہ بارہ سال کی عُمر میں ہی وُہ بڑے بڑے عالموں کا مقابلہ کرنے لگا ۔

اب بادشاہ نے اُسے شہسواری اور تیراندازی سکھانے کے لئے اُستاد مقرر کئے۔ پُنّوں خان نے یہ فن سیکھنے میں بھی کمال کر دکھایا۔ اور تھوڑے ہی دِنوں کے اندر مُلک بھر میں اُس کی سپہگری کی دھُوم مچ گئی ۔

Taj Tahir Foundation

سُلطان علی خان کی طرح پُنّوں خان بھی نہایت نیک دِل شہزادہ تھا۔ رعایا کو شہزادے سے بڑی عقیدت تھی۔ وُہ صرف رحم دِلی اور نیکی میں ہی مشہور نہیں تھا۔ بلکہ اُس کے مردانہ حُسن کا چرچا بھی دُور دُور پھیلا ہُوا تھا۔ وُہ جس طرف سے گُذرتا تھا۔ لوگ اُسے دیکھنے کو ٹوٹ پڑتے تھے۔

Taj Tahir Foundation

غزنی کا سوداگر

بھنبور اور کیچ مکران سے بہت دور غزنی میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ وہ کہنے کو تو سوداگر تھا۔ اور سوداگری کے لئے ہی وہ ملکوں ملکوں پھرتا رہتا تھا۔ مگر دراصل وہ ایک اعلیٰ درجے کا مصور تھا۔ اور اُسے تصویر کشی کا بہت شوق تھا۔ یہی شوق اُسے ہر ملک میں کھینچ لے جاتا۔ وہاں کی پرانی عمارتوں۔ خوب صورت نظاروں کی تصویریں کھینچتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت تجارت بھی کر لیتا تھا۔

شہزادہ پنوں خان کے حسن و جوانی کی شہرت

Taj Tahir Foundation

اس سوداگر تک بھی جا پہنچی۔ اور اُس نے شہزادے کی تصویر اُتارنے کے شوق میں اُسی وقت کیچ مکران کی تیاری شروع کر دی۔ ضروری تجارتی سامان لدوایا۔ اور ایک مختصر سا قافلہ لے کر کیچ مکران کی طرف چل پڑا ۔

شہزادہ پُنّوں خان کے شہر میں پہنچ کر سوداگر نے سب سے پہلا کام یہی کیا۔ کہ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہونے کی درخواست دی۔ اور شہزادے نے کمال مہربانی سے اجازت دے دی۔ جب سوداگر شہزادے کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ تو اُس کے حُسن و جمال کو دیکھ کر اُس کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ شہزادے جیسا خوب صُورت انسان اُس نے اپنی عمر میں نہ دیکھا تھا۔ وُہ دیر تک حیران کھڑا دیکھتا رہا۔ جب حواس بجا ہوئے تو شہزادے سے تصویر بنانے کی اجازت چاہی۔

Taj Tahir Foundation

شہزادے نے اُس کا دِل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اُسے اپنی تصویر بنانے کی اجازت دے دی ٭

کئی دِنوں کی کوشش سے سوداگر نے شہزادے کی تصویر تیار کر لی۔ اور شہزادے کو دکھائی۔ شہزادہ خود دیکھ کر حیران رہ گیا۔ واقعی اُس نے تصویر بنانے میں کمال کر دِیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ تصویر ابھی مُنہ سے بولا چاہتی ہے ٭

اس کے بعد سوداگر کُچھ مُدّت کیچ مکران میں ٹھہرا۔ یہاں کے لوگوں سے اُس نے بھنبور کی بہت تعرِیف سُنی۔ وہ اس سے پہلے بھی بھنبور کی تعرِیف سُن چکا تھا۔ اُس نے سوچا۔ کہ بھنبور یہاں سے بہت قریب ہے۔ بہتر ہے۔ کہ وہاں کی سَیر بھی کر لُوں ٭

یہ سوچ کر ایک قافلے کے ساتھ بھنبور کا رُخ کِیا۔ ایک مُدّت کے بعد یہ قافلہ بھنبور پہنچا۔

Taj Tahir Foundation

اور شہر کے باہر دریا کے کنارے خیمے لگا دِئے۔ سوداگر بھنبور کی ایک سرائے میں ٹھہرا۔ اور کئی دِن تک شہر کی سَیر کرتا رہا ؏

سوداگر کو بھنبور کی آب و ہوا بہت پسند آئی۔ شام کے وقت شہر کے مرد اور عورتیں دریا کے کنارے سَیر کرتے اور ٹھنڈی ہوا کا لُطف اُٹھاتے تھے۔ سوداگر کو یہ نظارے بہت بھائے۔ اُس نے بادشاہ سے اجازت لے کر دریا کے کنارے ایک باغ بنوایا۔ یہ باغ ایسا خوبصورت تھا۔ کہ سلطان آدم جام کی حکومت تو کیا شاید روئے زمین پر اُس کی ٹکّر کا کوئی باغ نہ ہوگا۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سچ مُچ جنّت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جسے لاکر زمین پر رکھ دِیا گیا ہے۔ باغ میں کئی نہریں جن کا پانی موتی کی آب کو شرماتا تھا۔ ایک دُوسری کو کاٹتی بہ رہی تھیں۔ اِن نہروں

کی وجہ سے باغ کئی حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جن میں قسم قسم کے پھُول کھلے ہوئے تھے۔ ان نہروں کے دونوں طرف سرو کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ اور اُن کے ساتھ دونوں طرف پھُولوں کے چمن۔ جگہ جگہ صاف پانی کے حوض جن میں مُرغابیاں کلیلیں کرتی پھرتی تھیں۔ حوضوں کے ساتھ ساتھ فواروں کی قطاریں تھیں۔ کہیں کہیں پانی کی چادر اِس زور سے گرتی تھی۔ کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی ؂

سوداگر نے باغ کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت عمارت بنوائی۔ اور اس عمارت کے مُختلف حصّوں کو دُنیا جہان کی نایاب اور خوب صُورت چیزوں سے سجایا۔ ایک حصّہ کو اُس نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویروں سے آراستہ کیا تھا۔ شہزادہ پُنّوں خان کی تصویر سوداگر نے ایسی جگہ لگائی۔ کہ

دروازے سے داخل ہوتے ہی سب سے پہلے
نظر اُس پر پڑتی تھی ۔

یُوں تو یہ سارا باغ خُوب صُورت تھا ۔ اور
شام کے وقت باغ کے ہر حصّے میں سَیر کرنے
والوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے ۔ مگر باغ کے
درمیان جو عمارت تھی ۔ اُسے دیکھنے کو خلقت ٹوٹی
پڑتی تھی ۔ اس حصّہ میں ایسی ایسی نایاب چیزیں
مَوجُود تھیں ۔ جنھیں دیکھ دیکھ کر سَیر کرنے والوں کا
جی نہ بھرتا تھا ۔ خاص طور پر شہزادہ پُنّوں خاں کی
تصویر کو لوگ بہت پسند کرتے تھے ۔

سوداگر نے باغ کی رونق بڑھانے کے لئے
ایک اَور کام یہ کیا ۔ کہ باغ کے ساتھ ہی باہر سے
آئے ہوئے قافلوں کے ٹھہرنے کے لئے ایک
سرائے ۔ اور دریا کے کنارے لوگوں کے نہانے
دھونے اور جانوروں کو پانی پلانے کے لئے ایک

خُوب صُورت گھاٹ بنا دِیا۔ اِس سے یہ فائدہ
ہُؤا۔ کہ جس قدر لوگ باہر سے بھنبور میں آتے
تھے۔ وُہ اسی سرائے میں ہی ٹھہر کر آرام پاتے
اور باغ کی سَیر کا لُطف اُٹھاتے تھے ؛

اس باغ کو بنوانے میں سوداگر نے روپیہ
پانی کی طرح بہایا تھا۔ عام لوگوں کے اندازے
کے مطابق بھی اس باغ پر کئی لاکھ روپیہ خرچ ہُؤا
تھا۔ چنانچہ اسی سبب سے لوگ اس کو " لاکھی
باغ " کہنے لگے۔ اور تھوڑی ہی مدّت میں یہ باغ
اِس نام سے مشہور ہو گیا ؛

Taj Tahir Foundation

سسّی کا خواب

سسّی جوان ہو چکی تھی۔ اور اکثر کچھ اُداس سی رہتی تھی۔ جب سے اُسے معلوم ہُوا تھا۔ کہ "مَیں بھنبور کے بادشاہ آدم جام کی بیٹی ہُوں۔ مگر باپ نے منحوس سمجھ کر دریا میں پھینک دِیا تھا۔ اور اتا نے مجھے یتیم سمجھ کر پالا ہے"۔ اُسے اپنی زندگی کچھ بھاری سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اکثر اِس فکر میں ڈوبی رہتی۔ کہ اگر میری شادی کسی دھوبی کے ساتھ ہو گئی۔ تو خدا جانے وہاں کیا پیش آئے۔ لیکن اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟ میرے نصیب ہی اَیسے ہیں۔ اگر مَیں بدقسمت نہ ہوتی۔

تو باپ مجھے پیدا ہوتے ہی دریا میں نہ پھینک دیتا۔ میں دھوبی کے جھونپڑے کی جگہ شاہی محلوں میں پلتی۔ شہزادی کہلاتی۔ اور کسی شہزادے سے بیاہی جاتی"۔ یہ سوچ کر وُہ رونے لگتی۔ اور جب روتے روتے تھک جاتی۔ تو چُپ چاپ چارپائی پر پڑ رہتی ۔

اتا اور اُس کی بیوی کو سسّی کی یہ پریشانی کسی طرح گوارا نہ تھی۔ وہ سسّی کو دلاسا دیتے۔ اور سمجھاتے بُجھاتے تھے۔ مگر سسّی کے غم کا اُن کے پاس کیا علاج تھا؟ اُن کا سارا پیار دلاسا بے کار ثابت ہوُا۔ اور سسّی کا پھُول سا چہرہ سنولا گیا ۔

ایک دِن سسّی روتے روتے سو گئی۔ اور خواب میں دیکھا۔ کہ چاند آسمان سے اُتر کے اُس کی گود میں آ پڑا ہے۔ سسّی نے اُسے پکڑنا چاہا۔ مگر آنکھ کھُل گئی۔ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا ۔

Taj Tahir Foundation

سسّی نے خواب کا ذکر اپنی سہیلیوں کے سامنے کر دیا۔ اور اُن سے تعبیر پُوچھی۔ سہیلیاں سسّی کی پریشانی سے بہت رنجیدہ رہتی تھیں۔ اُنھوں نے صلاح مشورہ کر کے سوہنی سے کہا۔ "اس خواب کے معنی یہ ہیں کہ تمھاری شادی کسی شہزادے سے ہو گی۔"

یہ کہہ کر سہیلیوں نے سسّی کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ سسّی اُن سے پیچھا چھُڑا کے بھاگی۔ اور گھر آ کے سوچنے لگی۔ کہ "ایک شہزادی کی شادی کسی شہزادے سے ہو جائے۔ تو اس میں قباحت کیا ہے؟" پھر وہ دُعا کرنے لگی۔ کہ "اے رحیم و کریم خدا۔ تیری رحمت سے تو کوئی بات دُور نہیں۔ تو آخر کب تک سُچّے موتی کو کنکروں میں رکھے گا؟"

سہیلیوں نے تو سسّی سے مذاق کیا تھا۔ مگر

سسّی کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ اُس کی شادی کسی خُوبصورت شہزادے سے ہو گی۔ ایک دِن وہ اسی خیال میں تھی۔ کہ اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اُس نے دیکھا۔ کہ ایک خُوب صُورت شہزادہ اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ وُہ اُسے پیار کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسی نظروں سے جو سسّی کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ سسّی نے چاہا۔ کہ بڑھ کر اُس سے لپٹ جائے۔ اور رو رو کر التجا کرے۔ کہ تم مجھے اپنی بنا لو۔ اس طرح شاید اُس کے دل کی مُراد پُوری ہو جائے۔ لیکن جب وُہ شہزادے کی طرف بڑھی۔ تو اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ کیا دیکھتی ہے۔ کہ وُہ اتا دھوبی کے گھر کھرے بان کی چارپائی پر پڑی ہے ؂

سسّی نے اس خواب کو بھول جانے کی بہت کوشش کی مگر نہ بھول سکی۔ شہزادے کی شکل ہر وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے رہتی۔ وہ سوچتی

کہ اگر کسی طرح مجھے معلوم ہو جائے۔ کہ یہ شہزادہ کہاں رہتا ہے۔ تو اُڑ کر اُس کے پاس جا پہنچوں۔ مگر خواب میں آنے والا ایک جھلک دِکھا کر غائب ہو گیا تھا۔ اور سسّی کے پاس اُس کی یاد کے سوا کچھ نہ تھا۔

سسّی کی پریشانی سے اُس کی سہیلیاں بھی پریشان رہتی تھیں۔ ایک دِن سب سہیلیوں نے مل کر سوہنی کو کہا۔ کہ "چلو لاکھی باغ کی سیر کرنے چلیں"۔ پہلے تو سسّی نے انکار کیا۔ مگر جب سہیلیوں نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا۔ تو مجبور ہو کر اُن کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔

سسّی سہیلیوں کے ساتھ باغ میں چلی تو گئی۔ مگر اُسے کوئی چیز نہ بھاتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ پھول کِھل کِھل کر اُس کا مُنہ چڑا رہے ہیں+ اُسے باغ میں بھی ہر طرف اُداسی چھائی ہوئی معلوم ہوتی

تھی ؛

سستی کا جی تو چاہتا تھا۔ کہ کہیں پڑ رہے۔ یا کسی کونے میں اکیلی بیٹھ کر رو دے۔ مگر سہیلیاں اُسے گھسیٹے لئے جا رہی تھیں۔ وُہ اُسے چھیڑتی تھیں۔ تاکہ وُہ بھی ہنسے۔ اور اُن کے ساتھ خوش خوش باغ کی سَیر کرے۔ مگر وُہ سستی کو خوش نہ کر سکیں ؛

وُہ سب کی سب سَیر کرتی کرتی باغ کی درمیانی عمارت میں جا پہنچیں۔ مُلک مُلک کی دستکاریاں اور پُرانے زمانے کی نایاب چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہُوئیں۔ مگر سستی کو ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ وُہ ایک مجبور قیدی کی طرح سہیلیوں کے ہمراہ پھرتی رہی ؛

تھوڑی دیر کے بعد بھولی بھالی لڑکیوں کا یہ جھُرمٹ اس تصویر خانہ میں پہُنچا۔ جہاں رنگا

رنگ تصویریں تھیں۔ سب سے پہلے اُن کی نظر
شہزادہ پنّوں خان کی تصویر پر پڑی۔ اور تصویر
کی خُوب صُورتی دیکھ کر سنّاٹے میں آگئیں۔ سسّی
اپنے خیالوں میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ ایک سہیلی
نے سسّی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔" دیکھو تو کتنا خُوبصورت
شہزادہ ہے۔ تم اس سے کیوں نہ شادی کر لو؟"
سسّی نے یہ سُن کر اسے دھکیل دیا۔ اُس کا
جی تو نہ چاہتا تھا۔ کہ وہ تصویر کو دیکھے۔ مگر خُدا
جانے اُس کی نظریں خود بخود تصویر کی طرف کیوں
اُٹھ گئیں۔ جب اُس کی نظر تصویر پر پڑی۔ تو وہ
کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ یہ تصویر تو اُسی شہزادے کی
تھی۔ جسے سسّی نے خواب میں دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر میں سسّی کی سہیلیاں چلنے لگیں۔
تاکہ دُوسری تصویریں دیکھیں۔ اور یہاں سے فارغ
ہوکر باغ کے باقی حصّوں کی سیر کریں لیکن سسّی

سر درد کا بہانہ کر کے وہیں بیٹھ گئی۔ اور سہیلیوں کو کہہ دیا۔ کہ جب تم سیر کر چکو۔ تو مجھے یہاں سے آکر اُٹھا لینا۔ میں اتنی دیر یہاں آرام کرتی ہوں۔

جب سہیلیاں چلی گئیں۔ تو سسّی اُٹھ کر تصویر کے پاس آئی۔ وُہ چاہتی تھی۔ کہ تصویر اُس سے میٹھی میٹھی باتیں کرے۔ مگر تصویر خاموش تھی۔ یہ دیکھ کر وُہ رونے اور رو رو کر تصویر سے کہنے لگی۔ کہ "خدا کے لئے مجھے اپنے قدموں میں بُلا لو"۔

سسّی ابھی وہیں کھڑی تصویر دیکھ رہی تھی۔ کہ باغ کا بُوڑھا چوکیدار اُدھر آنکلا۔ سسّی نے اُس سے پُوچھا "بابا تمہیں معلوم ہے۔ کہ یہ تصویر کس کی ہے؟"

چوکیدار نے کہا "بیٹی۔ اس کے سوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کہ یہ تصویر ایک مُلک کے شہزادے کی ہے"۔

سسّی کو یہ معلوم کر کے ایک لمحے کے لئے
خوشی ہوئی۔ مگر اُسے چونکہ تصویر والے شہزادے
کا ٹھکانا معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اِس لئے اُس کے
دِل پر فوراً غم کے بادل چھا گئے۔ وُہ ایک طرف
سر جُھکا کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں اُس کی سہیلیاں
آگئیں۔ اور وُہ ان کے ساتھ تصویر کا خیال دِل
میں لئے گھر چلی گئی۔

اتا اور اُس کی بیوی خوش تھے۔ کہ آج
اُن کی بیٹی باغ میں سَیر کرنے گئی ہے۔ اُنھیں یقین
تھا۔ کہ وُہ خوش خوش واپس آئے گی۔ مگر جب وُہ
واپس آئی۔ تو اُس کی حالت پہلے سے بھی زیادہ
خراب تھی۔ اُس کے پھُول سے چہرے پر آنسوؤں
کے نشان مَوجُود تھے۔ یہ حال دیکھ کر اتا اور اُس
کی بیوی اَور رنجیدہ ہوئے۔

اُس دِن سسّی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ بس

Taj Tahir Foundation

خواب والے شہزادہ کے دھیان میں پڑی رہی۔ تصویر دیکھ کر اُسے یقین ہوگیا تھا۔ کہ خواب صرف وہم نہ تھا۔ بلکہ خواب میں آنے والا شہزادہ اسی دُنیا میں موجود ہے۔ وُہ اِن ہی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ کہ اُسے نیند آگئی۔ خواب میں پھر اُسی شہزادے کو دیکھا۔ دیکھتے ہی اُس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اور رو رو کر اپنا حال بیان کیا۔ شہزادے نے اُسے اُٹھایا۔ تسلّی دی۔ اور کہا "میرا نام پُنّوں خان ہے۔ مَیں کیچ مکران کے بادشاہ سُلطان علی خان کا لڑکا ہُوں۔ میرا دِل بھی تمہیں ملنے کو تڑپ رہا ہے۔ اور مَیں جلد ہی تم سے ملوں گا"۔

سسّی ابھی کچھ اَور بھی پُوچھنا چاہتی تھی۔ مگر شہزادہ غائب ہوگیا۔ اور سسّی کی آنکھ کُھل گئی۔

سسّی کی منگنی

اِدھر پُنّوں خان کی یاد میں سسّی کی یہ حالت تھی۔ اُدھر اتّا کی برادری میں سسّی کے رِشتے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ خود اتّا اور اُس کی بیوی کو بھی یہ خیال تھا۔ کہ اب سسّی کی شادی کر دینی چاہیئے۔ شاید اسی طرح اس کی پریشانی دُور ہو جائے ؎

کچھ عرصہ تک تو اتّا کے رشتہ داروں میں سے کسی کو ہمّت نہ پڑی۔ کہ سسّی کا رِشتہ مانگے۔ لیکن آخر یہ سوچ کر کہ بیٹیوں کو ساری عُمر کون گھر بٹھا رکھتا ہے۔ اُس کے بعض رشتہ داروں نے

Taj Tahir Foundation

سسّی کے بیاہ کی بات چھیڑی۔ بہت سے لوگوں کو تو اتا نے ٹال دیا۔ مگر جب اُس کے ایک قریبی رشتہ دار نے اپنے نوجوان بیٹے کے لئے کہا۔ تو اتا سے انکار کرتے نہ بن پڑی۔ اور وُہ کہنے لگا۔ کہ مَیں ایک آدھ دِن میں اپنی بیوی سے مشورہ کر کے آپ کو آخری جواب دُوں گا۔

رشتہ داروں کے چلے جانے کے بعد اتا نے بیوی کو اونچ نیچ سمجھائی۔ اور کہا۔ "بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ جس لڑکے کے لئے سسّی کا رشتہ مانگتے ہیں۔ اُس جیسا دُوسرا ساری برادری میں کوئی نہیں۔ خُوب صُورت! نوجوان! محنتی اور نیک غرضیکہ تمام خوبیاں اُس میں مَوجُود ہیں"۔ اتا کی بیوی بھی راضی ہو گئی۔ اب صرف سسّی سے پُوچھنا باقی تھا۔ یہ کام اُس نے بیوی کے سپُرد کیا۔

رات کو ماں نے سسّی سے ساری حالت بیان کی۔سسّی نے کچھ جواب نہ دیا اور رونے لگی ماں نے سینے سے لگا لیا۔ اور کہا "بیٹی۔ بیٹیاں جوان ہو جانے کے بعد ماں باپ کے گھر اچھّی نہیں لگتیں۔ خدا نے چاہا۔ تو تُو بیاہ کے پڑوس میں ہی جائے گی۔ اور ہمارے قریب ہی رہے گی" سسّی نے اپنے ماں باپ کو اصل بات سے بے خبر رکھنا مناسب نہ جانا۔ اور ماں سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ "آپ میری شادی کی فکر نہ کریں۔ میری شادی شہزادہ پُنوّں خان سے ہو گی۔ جو کیچ مکران کے بادشاہ سُلطان علی خان کا فرزند ہے۔ نہیں تو میں ساری عُمر کنوّاری رہُوں گی"

یہ سُن کر اتا کی بیوی کانپ گئی۔ اُس نے سسّی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر سسّی تو پکّا ارادہ کر چکی تھی۔ اس پر ماں باپ کی کوششوں کا کوئی

Taj Tahir Foundation

اثر نہ ہُوا۔ اور وہ بچارے مجبور ہو کر چُپ ہو گئے

دُوسرے تیسرے دِن اتا نے اپنے رِشتہ داروں کو افسوس کے ساتھ بتایا۔ کہ میَں اور میری بیوی تو راضی ہیں۔ مگر سسّی کسی طرح نہیں مانتی۔ اور میَں اُسے مجبور بھی نہیں کر سکتا ؏

اتا کے رِشتہ دار یہ سُن کر غُصّے میں بھر گئے۔ اُنھوں نے سوچا۔ آخر سسّی کون ہے بادشاہ کی بیٹی ہے۔ کہ اُس نے انکار کر دیا۔ اُسے اتا کے بے جا لاڈ پیار نے خراب کر دیا ہے۔ اُس کی نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں۔ دیکھیں تو بھلا وُہ کس شہزادے کے ساتھ شادی کرے گی ؏

اتا کے رِشتہ داروں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ مگر اتا کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ کہ "بیٹی رضا مند نہیں"۔ یہ جواب سُن سُن کر اتا کے رِشتہ داروں کے کان پک گئے۔ آخر

اُنہوں نے سوچا۔ کہ اتا اور سسّی کو اُن کے اس غرور کا ایسا مزہ چکھانا چاہیئے۔ کہ ساری عمر یاد کرتے رہیں ۔

ایک دِن چند دھوبی مل کر سُلطان آدم جام کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور ہاتھ باندھ عرض کی "عالی جاہ۔ اتا دھوبی کی بیٹی سسّی جو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ اس قابل ہے کہ حضور اُسے اپنے محل کی زِینت بنائیں۔ حضور یقین کریں۔ کہ ایسی خوب صورت لڑکی چراغ لے کر ڈھُونڈیئے۔ تو بھی نہ ملے گی"۔

سلطان کو دھُوبیوں کی یہ بات پسند آئی۔ اُس کے گھر اولاد نہ تھی۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اسے اُس نے اپنے ہاتھوں دریا میں پھینک دِیا تھا۔ یہ خواہش دِل میں موجُود تھی۔ کہ شاید اللہ تعالےٰ اپنے فضل وکرم سے کوئی سلطنت کا وارث عطا

کر دے۔ اتّا دھوبی کی لڑکی کا ذِکر سُنا۔ تو پھر اپنی بے اولادی کا خیال آیا۔ چنانچہ بادشاہ نے دھوبیوں کو تو انعام دے کر رُخصت کر دیا۔ اور اتّا کو حاضر کرنے کا حُکم دِیا ؎

شاہی دربار میں حاضری کا حُکم سُن کر اتّا کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے یقین ہو گیا۔ کہ یہ سب اُس کے بھائی بندوں کی شرارت ہے۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ اُسی وقت تیار ہو کر شاہی دربار میں آ حاضر ہُوا ؎

بادشاہ اُس سے بُہت مہربانی کے ساتھ پیش آیا۔ پہلے کچھ دیر اُس کے حالات پُوچھتا رہا۔ پھر حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ اتّا کو اس بات کا پہلے ہی یقین ہو چُکا تھا۔ اُس نے کچھ دیر سوچ کر عرض کی" حضور۔ کل جواب دُوں گا" ؎

بادشاہ نے حکم دِیا" یُوں ہی سہی۔ مگر یاد رکھو۔ تمہارے سامنے دو چیزیں ہیں۔ میری بات

مان لی۔ تو عُمر بھر کا عیش و آرام ہے۔ نہ مانی۔ تو تُمہارے سارے خاندان کو کولھو ہیں پلوا دُوں گا۔"

اتا ہانپتا کانپتا گھر آیا۔ اور بیوی سے کُل حقیقت بیان کی۔ بیوی بھی کُچھ جواب نہ دے سکی۔ پھر اتا ستی کے پاس آیا۔ اُس کو تسلّی سے ساری بات سمجھا کر رونے لگا۔ اور کہا "بیٹی۔ اب میری سفید ڈاڑھی کی عزّت تیرے ہاتھ میں ہے"۔

ستّی نے کہا "ابا جان۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ آپ کل میرا ایک خط بادشاہ سلامت کے پاس لے جائیں۔ خدا نے چاہا۔ تو آپ کی مشکل آسان ہو جائے گی"۔

ستّی نے تنہائی میں بیٹھ کر خط لکھا۔ اور دُوسرے دِن جب اتا شاہی دربار کو جانے لگا۔ تو خط اور وزیر کے ہاتھ کا لکھا ہُوا شاہی فرمان

دے کر باپ کو رخصت کیا ۔

اتا کانپتا کانپتا شاہی دربار میں پہنچا۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ وہ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں زندگی سے ہی ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ اتنے میں بادشاہ سلامت کا بلاوا آ گیا۔ اور اتا نے حاضر ہو کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سسّی کا خط بادشاہ کے ہاتھ میں دے دیا ۔

بادشاہ نے جلدی جلدی خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا ۔

"پیارے ابا جان ۔ آپ کو معلوم ہو گا۔ کہ آج سے چودہ پندرہ برس پہلے آپ کے گھر ایک بدقسمت لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اور اُسے آپ نے منحوس جان کر دریا میں پھینک دیا تھا۔ آپ چاہتے تھے۔ کہ دنیا اِس منحوس لڑکی کے وجود سے پاک ہو جائے۔ لیکن وہ کم بخت بچ نکلی۔

ایک دھوبی نے اُسے دریا سے نکالا۔ وہ بدنصیب
اُسی دھوبی کے ہاں پلی۔ اور اب جوان ہوگئی
ہے ۔

"مجھے یقین ہے۔ کہ آپ کو یہ قصّہ یاد کر کے
دُکھ ہوگا۔ مگر مَیں کیا کروں۔ سُنائے بغیر چارہ نہیں
اب آپ کی بیٹی جوان ہے۔ اور دھوبی اُس کا
رِشتہ مانگتے ہیں۔ دھوبی تو راضی ہے۔ مگر وُہ کمبخت
لڑکی نہیں مانتی۔ چنانچہ دھوبیوں نے چڑکر آپ کو
دھوبی سے رِشتہ مانگنے پر اُکسایا ہے۔ اور آپ
اپنی اُسی منحوس بیٹی سے بیاہ رچانے کی فِکر
میں ہیں ۔

"پیارے ابّا جان۔ کیا اپنی بدنصیب بیٹی
کو دریا میں پھینک کے آپ کا جی نہ بھرا تھا۔ کہ
کہ اب آپ اُس کو اَور ستانے کے درپے ہیں۔
مُجھ بدقسمت کے حال پر رحم کیجئے۔ اور مُجھے جس

حال میں قُدرت نے رکھّا ہے۔ رہنے دیجئے۔

"اس تحریر کی سچّائی کے ثبوت میں وزیر کے ہاتھ کا لکھا ہُوا فرمان ساتھ بھیج رہی ہُوں۔

"میری پیاری امّاں کو میرا اسلام کہہ دیجئے۔"

آپ کی بدقسمت بیٹی

"ستّی"

جُوں جُوں بادشاہ یہ خط پڑھتا گیا۔ اُس کا رنگ زرد ہوتا گیا۔ اُسے اپنا پندرہ سال پہلے کا ایک گُناہ یاد آگیا۔ اور اپنا وجود لعنت معلوم ہونے لگا۔ آخر ستّی کا خط اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔ اور وُہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ انّا یہ یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

کچھُ دیر کے بعد جب بادشاہ کو ہوش آئی۔ تو وُہ اُٹھ کر انّا سے کہنے لگا "میرا گُناہ مُعاف کردو۔ تم نے میری بچّی کو پالا ہے۔ مَیں تُمہارا

احسان مند ہُوں۔ خدا کے لئے میرے گُناہوں پر پردہ ڈالو۔ میری بچّی سے کہنا۔ کہ اگرچہ میَں اس قابل نہیں ہُوں۔ کہ تجھے مُنہ دکھاؤں۔ مگر آخر تُو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ آج رات میَں اور تیری ماں تجھے ملنے آئیں گے"۔

یہ سُن کر اتا کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ بادشاہ کی اجازت پاتے ہی وہ بھاگا بھاگا گھر آیا۔ اور سارا قصّہ بیوی کو کہہ سُنایا۔ بیوی بھی بہُت حیران ہوئی۔ لیکن سسّی یہ باتیں سُن کر پہلے کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ اُسے تو یہ پہلے ہی معلوم تھا۔ کہ ایک دِن ایسا ہوگا۔

رات کو بادشاہ سلامت اور ملکہ لوگوں کی نظروں سے چھُپ چھپا کر اتا دھوبی کے گھر آئے۔ اتا پھُولا نہ سماتا تھا۔ اور جی میں کہتا تھا۔ کہ آج

چیونٹی کے گھر سلیمان آگیا"۔ بادشاہ اور ملکہ اپنی بیٹی کو گلے لگا کر خوب روئے۔ اور جب پندرہ سال کی جُدائی کی بھڑاس نکل گئی۔ تو پیار محبّت کی باتیں کرنے لگے۔ بادشاہ نے سسّی کو کہا۔ کہ "چلو بیٹی۔ محل تمہارے بغیر سُونے معلوم ہوتے ہیں"۔

سسّی نے کہا۔" ابّا جان میرے اَیسے نصیب کہاں؟ کہ میں محلوں میں رہُوں۔ مَیں ان جھونپڑیوں ہی میں بھلی معلوم ہوتی ہُوں"۔

باپ نے سسّی کو سینے سے چمٹا لیا۔ اور کہا "نہیں بیٹی۔ اپنے گنہگار باپ کا سینہ طعنے مار کر چھلنی نہ کرو۔ میرے گناہ بخش دو۔ اور چل کر اپنے باپ کے ویران محلوں کو آباد کرو"۔

سسّی نے کہا۔" ابّا جان۔ آپ یہ کیا کہتے ہیں۔ آپ کا اس میں کیا قصُور ہے۔ جو کُچھ میرے

نصیبوں میں لکھا تھا۔ وہی ہُوا۔ آپ کا حُکم سر آنکھوں پر! مگر جن بچاروں نے پندرہ سال میری خدمت کی اور بچوں کی طرح پالا ہے۔ اُن کو چھوڑ کر بھلا میں کہاں جا سکتی ہُوں؟"

ملکہ نے پیار سے کہا" بیٹی۔ ان کو بھی ساتھ لے چلو۔"

سستی نے کہا" لیکن اماں جان۔ میرے شاہی محلوں میں جانے سے ابا جان کی بدنامی ہو گی۔ لوگ سرگوشیاں کریں گے" بادشاہ سلامت اتا دھوبی کی لڑکی اپنے گھر لے گئے" اگر یہ نہ ہُوا تو اصل راز فاش ہو جائے گا۔ اور لوگوں کو پتہ چل جائے گا۔ کہ بادشاہ نے اپنی لڑکی کو پیدا ہوتے ہی دریا میں پھینک دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی۔ کہ میری خاطر ابا جان اپنی سلطنت اور رعایا میں بدنام ہوں۔ آپ مجھے یہیں رہنے دیجئے۔ میں

اس غریبانہ زندگی میں ہی خوش رہتی ہوں۔ جب آپ سے ملنے کو جی چاہے گا۔ آپ کو خبر کر دیا کروں گی۔ آپ جب چاہیں۔ مجھ سے آ کر مل جایا کریں۔"

بیٹی کی یہ پیاری پیاری باتیں سُن کر بادشاہ اور ملکہ دونوں بہت خوش ہوئے۔ اور سسّی کے اتا کے ہاں رہنے پر راضی ہو گئے۔ آخر ملکہ نے سسّی سے کہا" بیٹی۔ اپنے باپ سے کچھ مانگ تو لے تیری منّہ بولی مُراد پوری کر کے ہمیں خوشی ہو گی۔"

سسّی نے کہا" امّاں جان۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ کا ارشاد ہے۔ اس لئے کہتی ہوں۔ کہ ابّا جان اگر مجھے کچھ دینا ہی چاہتے ہیں۔ تو "لاکھی باغ" لے دیں۔"

ملکہ اور بادشاہ نے کہا" بیٹی! صُبح سے لاکھی باغ تیرا ہے۔ کل ہی باغ کی قیمت سوداگر

کو ادا کر دی جائے گی۔

چنانچہ دُوسرے ہی دِن بادشاہ نے باغ کی اصل لاگت سے کئی گُنا زیادہ قیمت دے کر باغ سوداگر سے خرید لیا۔ اور باغ کے کارِندوں کو سمجھا دیا۔ کہ آج سے یہ باغ شاہی ملکیّت ہے۔

اب باغ رعایا کی نظروں میں تو بادشاہ کی ملکیّت تھا۔ مگر اس کی اصلی مالک سسّی تھی۔ سسّی نے اپنی مرضی کے مُطابق باغ کو پہلے سے بھی زیادہ خُوب صُورت بنوایا۔ وُہ تنہائی کے وقت باغ میں جاتی۔ اور گھنٹوں پُنّوں خاں کی تصویر کے سامنے بیٹھی روتی رہتی۔

سسّی نے باغ کے مُنشی کو بُلا کر تاکید کر دی۔ کہ آج کے بعد جس قدر قافلے باہر سے آئیں۔ اور یہاں ٹھہریں۔ قافلے کے لوگوں کے نام اور پتے لکھ لیئے جائیں۔ اور جب تک میں خود رجسٹر

نہ دیکھ لوں۔ کسی کو جانے کی اجازت نہ دی جائے۔
اُسی دِن سے اِس حُکم پر عمل ہونے لگا۔ جو کوئی باہر سے آتا۔ اُس کا نام اور مکمّل پتہ لِکھ لیا جاتا۔ اور سسّی آکر دیکھتی۔ اور چونکہ سسّی نے سرائے میں ٹھہرنے اور گھاٹ پر جانوروں کو آرام پہنچانے کے کرائے بہت کم کر دئے تھے۔ اِس لئے قافلوں کی آمدورفت پہلے سے زیادہ ہوگئی۔

Taj Tahir Foundation

بلوچوں کے قافلے

ایک مدّت گذر گئی۔ بے شمار قافلے آئے
اور چلے گئے۔ ایک دن بلوچوں کا ایک قافلہ
کیچ مکران سے آیا۔ باغ کے منشی نے اُن کے
نام اور پتے لکھ کر سسّی کو دکھائے۔ کیچ مکران کا نام
پڑھ کر سسّی کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے
منشی کو حُکم دیا۔ کہ کیچ مکران کے سوداگروں کو حاضر
کرو۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں سوداگر آموجود ہوئے۔
سسّی نے پہلے تو اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں
پوچھیں۔ پھر شہزادہ پنّوں خان کے متعلق پوچھا۔
بلوچوں نے کہا" سرکار۔ پنّوں خان کیچ مکران کے

Taj Tahir Foundation

جواں سال اور خوب صورت شہزادے کا نام ہے
ہم سب اُسے جانتے ہیں۔ کیچ مکران کی رعایا اس
کا نام لے لے کر جیتی ہے"۔

یہ سُن کر سسّی گویا جی اُٹھی۔ اُس نے کیچ مکران
کے قافلے کے دو سرداروں کو کہا" جب تک تم
شہزادہ پُنّوں کو یہاں نہ لے آؤ۔ تُمہارا سارا قافلہ
قید رہے گا"۔

بلوچوں نے بہت منّت سماجت کی۔ اور کہا
کہ ہم کسی نہ کسی طرح شہزادہ پُنّوں خان کو لے
آئیں گے۔ مگر آپ قافلے کو قید نہ کیجئے۔ مگر سسّی
نے صاف انکار کر دِیا۔ پُنّوں خان کی محبّت میں
وُہ نرمی اور رحم دِلی سب کچھ بھول گئی۔

اب بلوچ اس کے سوا اَور کیا کر سکتے تھے۔
کہ کسی نہ کسی ترکیب سے پُنّوں خان کو لائیں۔
ورنہ چھٹکارا مشکل تھا۔ چنانچہ قافلے کے سردار خدا

کو یاد کر کے کیچ مکران روانہ ہوئے۔ اور رات دن ایک کر کے کیچ مکران جا پہنچے۔

وُہ دونوں پہلے تو سلطان علی خان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور رو رو کر تمام قصّہ اُسے کہہ سُنایا۔ لیکن سُلطان علی خان بُوڑھا ہو چُکا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بیٹے کو جُدا نہ کر سکتا تھا۔ اُسے بلوچوں کے رونے دھونے کا کُچھ خیال نہ آیا اور صاف انکار کر دیا۔ کہ "میں شہزادہ پُنّوں خان کو اتنے دُور جانے کی اجازت نہیں دے سکتا"۔

یہاں سے نا اُمّید ہو کر بلوچ شہزادہ پُنّوں خان کے دربار میں پُہنچے۔ اور اُسے ساری کہانی سُنائی۔ پہلے اپنی مُصیبت کا ذِکر اِس انداز میں کِیا۔ کہ پُنّوں خان کا دِل پسیج گیا۔ پھر سسّی کے حُسن وجمال کی تعریف ایسے لفظوں میں کی۔ کہ پُنّوں خان اُسی وقت چلنے پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ

سُلطان علی خان کو خبر کیئے بغیر پُنّوں خان بلوچوں کے ساتھ چل پڑا۔

جب پُنّوں خان کے جانے کی خبر سُلطان علی خان اور اُس کی بوڑھی ماں کو ہوئی۔ تو اُنہوں نے رو رو کر اپنا حال بہت بُرا کر لیا۔ وزیروں نے ہر چند اُنہیں تسلّی دی۔ مگر جن بوڑھے ماں باپ کا جگر بند اُنہیں چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔ اُنہیں کیسے چین نصیب ہو سکتا ہے؟

اُدھر ان بلوچوں کو اپنے بھائی بندوں کا جو سسّی کی قید میں تھے۔ بڑا خیال تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے بڑی تیزی سے سفر کیا۔ اور کئی ہفتوں کا رستہ دِنوں میں طے کر بھنبور پہنچ گئے۔ وُہ کئی دِنوں کے سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ اِس لئے شہزادہ پُنّوں خان کو لاکھی باغ کے ایک مکان میں سُلا دِیا۔ اور اُونٹوں کو باغ میں چرنے کیلئے چھوڑ کر

خود بھی سو رہے ہیں۔

اونٹ بھی کئی دِنوں کے بھوکے تھے۔ اُنہوں نے تھوڑی ہی دیر میں باغ کے خوب صورت پھولوں کا ستیاناس کر دیا۔ دربان اور منشی بھاگے بھاگے سسّی کے پاس گئے۔ اور بتایا۔ کہ چند نئے بلوچ آئے ہیں۔ اُن کے اونٹوں نے باغ کو ویران کر دیا ہے۔

سسّی غصے میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اور جہاں بلوچ سو رہے تھے۔ وہاں پہنچی۔ تاکہ بلوچوں کو سزا دے۔ مگر اُس نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور جگا کر پوچھا "جلد بتاؤ۔ شہزادہ پُنّوں خان کو بھی لائے ہو۔ یا نہیں؟"

بلوچوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور ہم انہیں بھی لے آئے ہیں۔ اور وُہ سامنے کے مکان میں آرام فرما رہے ہیں۔"

Taj Tahir Foundation

سسّی نے منشی اور دربان کو رخصت کر دیا۔ بلوچوں کو کہا۔ کہ "اچھا۔ تم آرام کرو"۔ اور خود پُنّوں خان کی طرف چل پڑی ۔

مکان میں جا کر دیکھا۔ تو ایک خوب صورت نوجوان جسے دیکھ کر چاند بھی شرم سے بادلوں میں مُنہ چُھپالے۔ غافل پڑا سو رہا ہے۔ اور اُس کے سنہرے بال خوب صورت چہرے کے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں۔ سوہنی آہستہ آہستہ اُس کے قریب گئی۔ تاکہ وُہ جاگ کر بے آرام نہ ہو۔ وہ چُپ چاپ اُس کے پاس پہنچ کر اُس کی بلائیں لینے لگی۔ رستے کی تکان کے سبب شہزادہ بالکل غافل پڑا تھا۔ اور اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے ۔

سسّی آہستہ آہستہ پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ اور پُنّوں خان کو پنکھا جھلنے لگی۔ تھوڑی

Taj Tahir Foundation

دبر میں پنوں خان کی آنکھ کھلی۔ تو وہ سسّی کو پاس بیٹھا دیکھ کے حیران رہ گیا۔ سسّی کا نام وہ پہلے ہی سُن چکا تھا۔ اور اُس کے دل میں سسّی کو دیکھنے کا شوق بھی تھا۔ لیکن اب وہ اُسے دیکھ کے ہزار جان سے اُس پر شیدا ہو گیا۔

دُوسرے دن سسّی نے بلوچوں کے قافلے کو انعام اکرام دے کر آزاد کر دیا۔ اور خود پُنّوں کی رفاقت میں خوشی کے دن گذارنے لگی۔

بلوچوں کے قافلے نے آزادی پا کے بھنبور میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور وہ کیچ مکران کی طرف روانہ ہو گئے۔

Taj Tahir Foundation

شادی

پُنّوں خان کُچھ دِن تو لاکھی باغ میں سسّی کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔ ایک دِن سسّی نے اس سے کہا۔ کہ "ہُوں ہم دُنیا کی نظروں سے چُھپ کر کب تک زِندگی بسر کریں گے۔ کیوں نہ کوئی ایسی تدبیر کریں۔ کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے"

پُنّوں خان نے جواب دِیا" کوئی ایسی تدبیر ہوسکتی ہے۔ تو بتاؤ"

سسّی نے کہا" میرے ماں باپ میرا رِشتہ آخر کار کسی دھوبی کو ہی دیں گے۔ کیوں نہ تم کپڑے دھونا سیکھ لو۔ تاکہ میں پھر اپنے باپ ماں سے

کہہ سُن کے اُنہیں راضی کر سکُوں"۔

پُنّوں بخوشی راضی ہوگیا۔ اُسی دِن سے اس نے کپڑے دھونے شروع کر دیئے۔ اور تھوڑے ہی دِنوں میں وُہ اچّھا خاصا دھوبی بن گیا۔

ایک دِن موقع پاکر سستی نے اپنی ماں سے یہ بات کہہ دی۔ کہ میری شادی پُنّوں سے کردی جائے۔ ماں باپ تو یہ چاہتے تھے۔ کہ سسّی راضی ہو جائے۔ اُنھوں نے پُنّوں خاں کو دیکھا اُس کا حسب نسب پُوچھا۔ اُس نے صاف کہہ دیا۔ کہ مَیں خاندانی دھوبی ہُوں۔ میرا باپ کیچ مِکران میں دھوبیوں کا کام کرتا ہے۔ اُس کا نام سُلطان علی خان اور کام لوگوں کے دِلوں کی مَیل صاف کرنا ہے۔

سستی کے ماں باپ راضی ہو گئے۔ اور شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اِدھر تو یہ پُنّوں خان کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اُدھر جب کیچ مکران میں بلوچوں کا قافلہ پہنچا۔ اور سُلطان علی خان کو معلوم ہُوا۔ کہ وہ ظالم بلوچ جو شہزادے کو اُڑا لے گئے تھے۔ واپس آ گئے ہیں۔ تو اُس نے فوراً اُنہیں حاضر ہونے کا حُکم دِیا ۔

بلوچ حکم سُنتے ہی دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے درباریوں کو حکم دِیا۔ کہ "ان ظالموں کے بال بچّوں کو قید کر دیا جائے۔ اور جب تک یہ شہزادہ پُنّوں خان کو واپس نہ لائیں۔ اُنہیں بھوکا پیاسا رکّھا جائے۔ اُنھوں نے مجھ بُوڑھے کو ستایا اور ایک طرح سے بے اولاد کر دیا ہے۔ مَیں بھی ان کی اولاد کو ان سے جُدا کر دینا چاہتا ہُوں"۔ یہ کہہ کر وُہ بلوچوں سے مخاطب ہُوا۔ اور کہا" بد بختو۔ اگر اپنی اور اپنے بیوی بچّوں کی

خیریت چاہتے ہو۔ تو جلد میرے فرزند کو لا کر مجھ سے ملاؤ۔ ورنہ تمہارے بال بچوں کو تلوار کی گھاٹ اُتار دیا جائے گا"۔

بلوچ یہ حکم سن کر کانپ گئے۔ اور بہت جلدی شہزادے کو واپس لانے کا اقرار کر کے بھنبور کی طرف روانہ ہو گئے۔

جس دن یہ بلوچ بھنبور پہنچے۔ اُس دِن سسّی اور پُنّوں خان کی شادی کا دن تھا۔ پُنّوں خان کو جب علم ہُوا۔ کہ کیچ مکران کے سوداگر بھی آئے ہوئے ہیں۔ تو اُس نے اُنہیں بھی بُلا لیا۔ اور اُن کی خُوب خاطر تواضع کی۔

سُلطان آدم جام نے خُفیہ خُفیہ تحفے تحائف پہنچا دِئے تھے۔ اتا کی برادری جمع تھی۔ باجوں گاجوں کے شور سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ قاضی آیا۔ اور بھری مجلس میں دونوں کا نکاح پڑھ کے رُخصت ہو گیا۔

Taj Tahir Foundation

خاتمہ

بلوچوں کو ایک پل چین نہ تھا۔ انہیں خطرہ تھا۔ کہ اگر ذرا بھی دیر ہوگئی۔ تو سُلطان علی خان اُن کے بیوی بچوں کو کولھو میں پلوا دے گا۔ اُنھوں نے شادی کے مَوقع کو غنیمت جانا۔ اور علیحدہ بیٹھ کر سوچا۔ کہ رات کو شادی کی محفل میں پُٹھوں کو بے ہوشی کی دوا پلا دینی چاہیئے۔ اور جب وُہ بے ہوش ہو جائے۔ تو اُونٹوں پر بٹھا کر بھاگ جانا چاہیئے۔

رات کو شادی کی محفل بڑے زوروں پر تھی۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی چھائی ہوئی معلوم ہوتی

تھی۔ بلوچوں کو پُنوّں خان نے اپنے وطن کے دوست سمجھ کر اپنے قریب جگہ دی۔ ایک بلوچ نے دُودھ کا ایک گلاس پُنوّں کی خدمت میں پیش کیا۔ اِس دُودھ میں بے ہوشی کی دوا ملی ہوئی تھی۔ پُنوّں نے دوست کا تُحفہ سمجھ کر پی لیا۔

کچھ دیر کے بعد پُنوّں خان بے ہوش سا ہوگیا۔ لوگوں نے اُٹھا کر اُسے اندر پلنگ پر ڈال دیا۔ اور بلوچوں کو اُس کی حفاظت کے لئے وہیں چھوڑ دیا۔

اِدھر بلوچ موقع کی تلاش میں تھے۔ کہ لوگ سو جائیں۔ تو وہ پُنوّں کو اُٹھا کر بھاگ جائیں۔ اُدھر سسّی سہیلیوں کے جھرمٹ میں پھُولی نہ سماتی تھی۔ سہیلیاں اُسے بار بار چھیڑتی اور کہتی تھیں۔ "دُولھا ہے تو دھوبی۔ مگر شکل تو شہزادوں جیسی

ہے "۔

سسّی دِل میں کہتی "کم بختو۔ تمہیں کیا عِلم ہے۔ کہ جس کی شکل شہزادوں جیسی ہے۔ وُہ ہے بھی شہزادہ ہی "۔ یہ خیال کر کے سوہنی کا پھول سا چہرہ خوشی سے کِھل جاتا۔ وہ یہ سوچ کر آپے سے باہر ہو جاتی۔ کہ اُس کی زِندگی اُس کے چاہیتے پُنوّں خان کے ساتھ گُذرے گی "۔

خوشی ہو یا رنج۔ نیند اپنی چادر میں تمام دُنیا کو لپیٹ لیتی ہے۔ جب شادی کی گہما گھمی پر بھی نیند نے فتح پائی۔ تو بلوچوں نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور پُنوّں خان کو ایک اُونٹ کے کجاوے پر لِٹا کے کیچ مکران کا رُخ کیا ۔

رات تو شادی کی گہما گھمی میں گُذر گئی لیکن صبح ہوتے ہی یہ خبر بجلی بن کر سسّی کے سینے پر گری۔ کہ پُنوّں خان غائب ہے۔ اور بلوچ اُسے

اُٹھا کر لے گئے ہیں ۔

سسّی نے یہ سُن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ اور کپڑوں کو پھاڑ ڈالا۔ ماں باپ نے آکر اُسے سنبھالا۔ بے ہوش پڑی ہوئی کو اُٹھا کر اندر لے گئے۔ وہ سارا دِن بے ہوش پڑی رہی۔ شام کو ہوش آتے ہی وہ کیچ مکران کی طرف دوڑ پڑی ۔

صبح تک وہ بھنبور سے دُور نِکل چکی تھی۔ وہ اونٹوں کے پاؤں کے نشان پر بھاگتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ میدانی علاقے سے گذر کر اُس خطرناک ریگستان میں داخل ہوئی۔ جسے "تھل مارو" کہتے ہیں ۔

"تھل مارو" مِیلوں تک پھیلا ہُوا ہے۔ اُس میں پانی یا ہریاول کا نام و نشان نہیں۔ پُرانے زمانے میں جو قافلے ادھر سے آتے جاتے تھے۔ وہ اپنے پاس کئی دنوں کا کھانا پانی رکھ لیتے

تھے۔ تاکہ راستے میں بھوک پیاس سے مر نہ جائیں مگر سسّی کے پاس تو پنّوں کے نام کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ پنّوں خان کی یاد کو سہارا بنائے چلی جا رہی تھی ۔

بلوچوں نے جب پنّوں خان کو بھگائے لئے جا رہے تھے۔ ایک دو دِن تو اُسے دوا پلا پلا کے بے ہوش رکھا۔ مگر پھر یہ سمجھ کر کہ اب بہت دُور نکل آئے ہیں۔ اور اب پنّوں ہوش میں آجانے پر واپسی کا نام نہ لے گا۔ پنّوں کو دوا پلانا ترک کر دِیا ۔

پنّوں کو ہوش آیا۔ تو اُس نے اپنے آپ کو "تھل مارو" میں پایا۔ پہلے تو اُسے بہت حیرت ہوئی۔ لیکن جب غور کیا۔ تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اُس نے چاہا۔ کہ ابھی بھاگ نکلے۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ بلوچ پکڑ لیں گے۔ اسی طرح بے ہوش

پڑا رہا۔

دوپہر کو بلوچوں نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا۔ جب وُہ سو گئے۔ تو پُنّوں آہستہ سے اُٹھ کر اُلٹے قدموں بھاگا۔ اور بلوچوں کے جاگنے سے پہلے پہلے دُور نکل گیا۔

اُدھر سسّی "پُنّوں پُنّوں" پکارتی اور بین کرتی کیچ مکران کے راستے پر قدم مارتی چلی جا رہی تھی۔ دوپہر کی دھوپ نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ جب تک ہمّت نے سسّی کا ساتھ دیا۔ وُہ برابر چلتی رہی۔ لیکن آخر کار بے ہوش ہو کر تپتی ہوئی ریت پر گر پڑی۔ کچھ فاصلے پر ایک گڈریا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ ایک عورت دُلہن بنی بھاگے چلی جا رہی ہے۔ تو وہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے دیکھتے دیکھتے سسّی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

Taj Tahir Foundation

گڈریا بھاگ کر اُس کے قریب جا پہنچا۔ دیکھا۔ کہ ایک کمھلایا ہُؤا پھُول گردو غبار میں اٹا پڑا ہے۔ سسیؔ اگرچہ بالکل بے ہوش تھی۔ لیکن اب بھی اُس کے مُنہ سے "پُنّوں پُنّوں" کی آواز آرہی تھی۔

گڈریے نے آگے بڑھ کر کچھ پُوچھنا چاہا۔ مگر سسیؔ کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور اُس کی رُوح پرواز کر گئی

گڈریے کے دِل میں خیال آیا۔ کہ سسیؔ کا قیمتی زیور اُتار لے۔ مگر جب اُس نے سسیؔ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو زمین پھٹ گئی۔ اور سسیؔ کا جسم اس میں غائب ہو گیا۔

گڈریا یہ تماشا دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور اُس کے دِل پر ہیبت طاری ہو گئی۔ وُہیں بیٹھ گیا۔ توبہ کی۔ خدا سے دُعا مانگی۔ اور جہاں سسیؔ کی لاش

Taj Tahir Foundation

غائب ہوئی تھی۔ وہاں قبر کا نشان بنا کر فاتحہ پڑھی ۔

وُہ ابھی فاتحہ پڑھنے سے فارغ نہ ہُوا تھا۔ کہ اُسے دُوسری طرف سے ایک نوجوان اپنی طرف آتا دِکھائی دِیا۔ یہ نوجوان بے تحاشا بھاگا آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وُہ گڈریے کے قریب آپہنچا۔ اور پُوچھنے لگا۔ "یہ قبر کِس کی ہے"؟

گڈریے نے کہا۔ "مجُھے اِس کے سوا کچھ علم نہیں۔ کہ یہ قبر ایک نوجوان لڑکی کی ہے۔ جس نے دُلہنوں کے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وُہ اس طرف سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اور یہاں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ وُہ "پُنّوں پُنّوں" پُکار رہی تھی۔ اور اسی نام کا وِرد کرتے کرتے اُس نے جان دے دی ۔

یہ سُنتے ہی پُنّوں لرز گیا۔ اور کانپ کر قبر

Taj Tahir Foundation

پر گر پڑا۔ گرتے ہی اُس کی رُوح جسم کی قید سے
آزاد ہوگئی ٭

گڈریا حیران کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اچانک
قبر پھٹ گئی۔ اور پُنّوں کی لاش اُس میں سما گئی۔
گڈریے نے دوبارہ قبر پر مٹی ڈالی۔ اور سرہانے
بیٹھ کر فاتحہ پڑھنے لگا ٭

اچانک آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔
بجلی چمکنے لگی۔ اور بُوندا باندی ہونے لگی۔ گڈریا
حیران کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ قصّہ
اُس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ کالے
کالے بادلوں میں ایک نوجوان مرد اور ایک حسین
عورت جھولا جھول رہے ہیں۔ اور آسمان پر سے
حُوریں اُن پر پھُول برسا رہی ہیں ٭

اُس نے غور سے دیکھا۔ یہ "سسّی اور پُنّوں"
تھے ٭

سید حمید علی نے امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام پنڈت دھرم چند بھارگو بی۔ ایس سی چھپوا کر شائع کیا

Taj Tahir Foundation

ننھّی مُنّی کتابیں

ان کتابوں میں بہت ہی آسان اور پیاری زبان استعمال کی گئی ہے سبق ایسے تیار کیئے گئے ہیں۔ جن میں بچے بیحد دلچسپی لیتے ہیں۔ اور جن سے اُن کا علم اور تجربہ بڑھتا ہے۔ جانوروں پر۔ پیڑوں پر۔ عمارتوں پر۔ تاریخ۔ سائنس کے آسان تجربوں پر۔ جنہیں سیکھ کر بچّے اپنے آپ کو جادُوگر سمجھ لیتے ہیں۔ حفظِ صحت اور دوسری ضروری چیزوں پر بہت چھوٹے چھوٹے سبق لکھے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ ننھّی ننھّی کہانیاں۔ آسان آسان اور پُرلطف نظمیں ہنسی کی باتیں ایک سے بول اور بچّوں کے مذاق کی اَور چیزیں ان میں جمع کی گئی ہیں۔ کتابوں کے ٹائیٹل اور باقی چیزیں ایسی دلفریب بنائی گئی ہیں جنہیں دیکھکر بچّے بے حد خوش ہونگے۔ قاعدہ پڑھاکر یہ کتابیں بچّوں کے ہاتھوں میں دے دیجئے۔ اور سمجھ لیجئے۔ کہ اُن کے دل میں اردو زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ ان پانچ کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ ننھّی کتاب۔ قیمت ۲/۷ پائی	۳۔ پیاری کتاب۔ قیمت ۳/۷ پائی
۲۔ مُنّی کتاب۔ قیمت ۱۰/۶ پائی	۴۔ دلاری کتاب۔ قیمت ۹/۶ پائی

۵۔ ہماری کتاب۔ قیمت ۵/۶ پائی

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور

صرف سرورق اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں چھپا۔

Taj Tahir Foundation